فُل کورٹ ریفرنس

الوادعی خطاب

از

عزت مآب جناب جسٹس جواد ایس خواجہ،
چیف جسٹس آف پاکستان

آئینی مدتِ منصبی کی تکمیل کے موقع پر

مورخہ 9 ستمبر 2015ء

میرے معزز ساتھی ججز، سپریم کورٹ آف پاکستان،

فاضل اٹارنی جنرل فار پاکستان،

معزز نائب چیئرمین، پاکستان بار کونسل،

معزز صدر، سپریم کورٹ بار ایسوسی ایشن،

قابلِ احترام عہدیداران و ممبرز بار ایسوسی ایشنز،

معزز مہمانانِ گرامی،

خواتین و حضرات،

السلامُ علیکم!

حمد اُس خدا کی جس نے دن اور رات بنائے اور جس نے سیاہ اور سفید کی تمیز اور پرکھ ہمارے ضمیر میں ڈال دی۔

ثناء رحمت اللعالمین کی جو ہر غریب، نادار، یتیم اور مفلس کے ملجا و ماوا ہیں۔

آج اس محفل سے مخاطب ہونا میرے لئے باعثِ اعزاز ہے۔ مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ آج میں رسمی گفتگو سے ہٹ کر کچھ دل کی باتیں آپ حاضرینِ محفل کے گوش گزار کر سکتا ہوں۔ دراصل بات یہ ہے کہ کچھ حقیقتیں تلخ ہیں اور کچھ شیریں مگر آج اس موقع پر دونوں کا بیان ضروری ہے۔

ہمارے ہاں ایک روایت ہے کہ اعلیٰ عدلیہ کے ہر جج کے ریٹائر ہونے پر ایک الوداعی تقریب منعقد ہوتی ہے جس میں کچھ تعریفی کلمات کہے جاتے ہیں اور نظامِ عدل کی بہتری کے لئے کچھ تجاویز بھی دی جاتی ہیں۔ میں اِن انمول گھڑیوں کو رسمی کلمات کی نذر نہیں کرنا چاہتا۔ ہم ججوں کو مقدمات کی سماعت کے دوران ایسے مواقع میسر نہیں آتے کہ جہاں ہم اپنے زیرِ بحث مقدموں سے ہٹ کر کوئی بات کریں اور اس ملک میں رائج نظامِ عدل کی مجموعی کارکردگی کا جائزہ لیں۔

اس تناظر میں آج میں اس مقدس ادارے یعنی نظامِ عدل کے بارے میں جس کی خدمت میں، میں نے عمرِ عزیز کی چار دہائیاں گزار دی ہیں، کچھ باتیں کہنا چاہتا ہوں۔ ان باتوں کا مقصد خود احتسابی ہے۔ ایسی کڑی اور بے لاگ خود احتسابی کے بغیر ہم نظام کو بہتر نہیں بنا سکتے۔ اس لئے میں آپ کی اجازت سے آج کی یہ محفل خود احتسابی کی نذر کرتا ہوں۔

ہمارے آئین کے آرٹیکل 37 کی شق (د) میں عوام سے یہ وعدہ کیا گیا ہے اور ریاستی اداروں پر یہ ذمہ داری عائد کی گئی ہے کہ وہ جلد اور سستے انصاف کی فراہمی کو یقینی بنائیں گے۔ لہٰذا دیکھنے کی بات یہی ہے کہ عوام اور سائلان کو، جو کہ انصاف کے متلاشی ہیں، فوری اور سستا انصاف مل رہا ہے یا نہیں اور آیا ہمارے ملک میں ایسا نظامِ عدل موجود ہے جو ہر فرد کو جلد اور سستے انصاف کی ضمانت دے؟

سامعین معزز! خواتین و حضرات، میں یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہوں کہ بدقسمتی سے اِن سوالوں کا جواب نفی میں ہے اور یہ صرف میری ذاتی رائے نہیں بلکہ اعداد و شمار اس بات کا بیّن ثبوت مہیا کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں، گزشتہ سال میں

نے اپنے عملے کے تعاون سے ایک تحقیقاتی رپورٹ مرتب کروائی ہے۔ اس رپورٹ سے یہ عیاں ہے کہ ایک دعویٰ کے عدالت میں دائر ہونے سے لے کر سپریم کورٹ میں اُس کا حتمی فیصلہ ہونے تک اوسطاً پچیس سال لگ جاتے ہیں۔ یہ اوسط ہے۔ بہت سے دعوے تو تین تین پشتوں تک کھنچ جاتے ہیں۔ فوجداری مقدمات میں بھی FIR سے اور چالان عدالت میں جمع ہونے سے لے کر سپریم کورٹ کا فیصلہ آنے تک ایک عرصہ دراز بیت جاتا ہے۔ کئی مرتبہ یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ قید و بند کی صعوبتیں جھیلنے والا ملزم جب بالآخر بری ہوتا ہے تو اُس کی عمر کے کئی سال پسِ زنداں گزر چکے ہوتے ہیں اور عمر کے اِس زیاں کا کوئی ازالہ ممکن ہی نہیں ہوتا اور یہ صرف اُس بدنصیب کی ہی بدبختی نہیں بلکہ اس کے بیوی بچے ماں باپ عزیز و اقارب سبھی ایک کرب میں مبتلا رہتے ہیں۔ اول تو پولیس، وکلاء اور عدالتوں سے ہی اُنہیں کوئی خاص ہمدردانہ رویہ نہیں ملتا۔

سالہا سال تک مقدمات کی پیروی کرنے کے لئے فریقین مقدمہ کو بھاری اخراجات بھی اٹھانے پڑتے ہیں۔ لہٰذا اگر عوام الناس میں یہ تاثر قائم ہے کہ انصاف دینے پر مامور ادارے مثلاً عدلیہ، پولیس، وکلاء اور دیگر سرکاری و نیم سرکاری ادارے آئینی تقاضا زیرِ آرٹیکل 37 (د) پورا کرنے میں مستعد نہیں، تو یہ تاثر بے جا نہیں بلکہ میں چار دہائیوں کے ذاتی مشاہدے اور حالیہ تحقیقاتی مطالعے کی بنیاد پر اس عوامی تاثر کا اثبات کرتا ہوں۔ تشویش اس بات پر ہے کہ 1975ء میں جب میں نے وکالت کا آغاز کیا تھا تو صورتِ حال ایسی نہ تھی۔ گزشتہ چار دہائیوں میں رائج نظام میں بہتری نہیں بلکہ بتدریج انحطاط واقع ہوا ہے۔ ان اداروں کو اور خود معاشرے اور سماج کو شعوری طور پر اپنے گریبان میں جھانکنے کی ضرورت ہے کیونکہ ایسی خود نگری اور احساس زیاں ہی بہتری کی طرف پہلا قدم ثابت ہوتے ہیں۔

میں محفل میں موجود نوجوانوں کو بتانا چاہتا ہوں کہ ہمارے نظامِ عدل کی حالت ہمیشہ ایسی نہیں تھی۔ میرے تحقیقاتی عملے نے پرانے قانونی جرائد کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ آج سے سو سال قبل مقدموں کا اوسط دورانیہ صرف 1 ایک سال تھا۔ اس عرصے میں مقدمہ پہلی عدالت سے لے کر آخری عدالت تک پہنچ جاتا تھا۔ آج اسی کارروائی میں پچیس 25 سال لگتے ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ 1970ء کی دہائی میں جب میں نے وکالت شروع کی تھی، تب بھی حالات اتنے ابتر نہیں تھے جتنے آج ہیں۔

ان اعداد و شمار کی بنیاد پر میں سمجھتا ہوں کہ ریاست کے تمام اعضاء کو یہ برملا اعتراف کرنا چاہئیے کہ جس ''سستے اور فوری انصاف'' کا وعدہ ہمارا آئین عوام سے کرتا ہے، ہم اُس وعدہ کو نبھانے میں فی الحال کامیاب نہیں ہوئے۔ اس لئے دیکھنے کی بات یہ ہے کہ موجودہ نظام کی ناکامی کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے اور اِس نظام کی خامیوں کو کس طرح دور کیا جا سکتا ہے؟

خود احتسابی کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اس تجزیہ کا آغاز عدلیہ سے کریں۔

آج سے سولہ سال پہلے جب میں نے پہلی بار مسندِ قضا کو قبول کیا اُس وقت میں نے پاکستان کے آئین کے تحت ایک حلف اُٹھایا تھا یہاں پر اُس آئینی حلف کے ایک جملے کو دہرانا چاہتا ہوں۔ اُس حلف میں لکھا تھا:

''میں ہر قسم کے لوگوں کے ساتھ بلا خوف و رعایت و بلا رغبت و عناد قانون کے مطابق انصاف کروں گا''۔

سب جج جب اپنے مقدس منصب کا حلف اٹھاتے ہیں تو یہ قسم اٹھاتے ہیں کہ ہم اپنے فیصلوں پر کسی خارجی محرک کو اثر انداز نہیں ہونے دیں گے۔ نہ کسی لالچ کو اور نہ کسی خوف کو۔ مگر میں بڑے احترام سے یہ عرض کروں گا کہ بعض اوقات میں نے عدل کے ایوانوں میں خوف کے کئی روپ دیکھے۔ اس خوف کا سبب کہیں دھونس اور دباؤ تو کہیں پیسے والوں یا اثر رسوخ والوں کی ناراضگی کا خوف۔ یہ عوامل ماضی قریب کی تاریخ میں زیادہ نمایاں ہو کر سامنے آئے۔ میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ عدلیہ کے ایوانوں میں بے باکی اور بے خوفی کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی علم و فضل اور پارسائی کی۔

ایوانِ عدل کی رونق بے خوف چہروں سے ہی ہوتی ہے۔ اس چمک کو نکھارنے کے لئے معاشرے کے ہر فرد پر اور بلخصوص وکلاء اور ہم ججوں پر لازم ہے کہ ہم سب مل کر اور بے خوف ہو کر اس پیشہ وارانہ بدعملی اور بے راہ روی کا مقابلہ کریں جو بدقسمتی سے اس نظام میں سرایت کر گئی ہے اور جس کی وجہ سے غریب و نادار فریقینِ مقدمہ کو جلد اور سستا انصاف میسر نہیں ہوتا۔

اب میں ایک اور معاملے کی نشاندہی کرنا چاہتا ہوں۔ جسے ہمارے معاشرے میں بسا اوقات ''دید اور مروت'' کا گمراہ کن نام دیا جاتا ہے۔ یہ ''دید و مروت'' عدلیہ کے لئے بہت خطرناک چیز ہے کیونکہ یہ ہمیں بے باک اور دلیرانہ فیصلے کرنے سے روک سکتی ہے اور یوں نظامِ عدل میں انحطاط کا سبب بن سکتی ہے۔ اس روش کو شعوری طور پر پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے تاکہ ہم آئین اور حلف کی وفاداری مندرجہ بالا الفاظ کے عین مطابق کر سکیں۔

اس امر کے علاوہ اگر کوئی چیز عدلیہ کو انصاف مہیا کرنے میں حائل ہو سکتی ہے تو وہ ہے بے حسی۔ عدل کسی منصب کسی پیسے اور کسی نوکری کا نام نہیں۔ یہ ایک صفتِ خدائی ہے اور کسی بھی صفتِ خدائی کا ادراک کرنے کے لئے صرف عقل اور محنت کافی نہیں ہوتے۔ مقامِ عدل تک رسائی دلِ بینا کے راستے سے ہی ممکن ہے۔ قاضیِ عادل صرف وہ شخص ہو سکتا ہے جس کے سینے میں ایک دردمندانہ دل دھڑکتا ہو۔ درونِ سینہ حساس دل کی دھڑکن ہی عدل، انصاف اور انسانیت کے تقاضے پورا کر سکتی ہے۔

دلِ بینا بھی کر خدا سے طلب
آنکھ کا نور دل کا نور نہیں

انصاف کی فراہمی کے لیے ایسا دل درکار ہے جو خودغرضی کی قید سے آزاد ہو جو اپنوں کے علاوہ غیروں کا درد بھی محسوس کرتا ہو۔

اب میں اپنے آپ پر لاگو ضابطۂ اخلاق کی ایک اہم شق کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ اس ضابطے کی شق میں یہ لکھا ہے کہ جج اپنے زیرِ سماعت مقدمات کو جلد نمٹانے کے لئے جو بھی اقدامات لازم ہیں، اُنہیں اُٹھانے سے

گریز نہیں کرے گا اور ضابطۂ اخلاق کے اسی آرٹیکل میں درج ہے کہ جو جج اس امر سے تغافل برتے گا وہ اپنے کارہائے منصبی کی ادائیگی سے وفادار نہیں اور یہ تغافل جج میں بہت بڑی خامی ہے۔ ضابطۂ اخلاق کے اس فریضے کی بجا آوری جج اکیلا نہیں کرسکتا اس کام کے لئے بہرحال ہمارے نظامِ عدل میں وکلاء کی نیک نیتی، تن دہی اور فرض شناسی لازمی ہے۔

اب میں نظامِ عدل کے دوسرے اہم ستون یعنی وکلاء برادری کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔ 1975ء سے 1999ء تک، 24 سال میں اس برادری کا حصہ رہا۔ وکلاء برادری کا کردار اس لئے بہت اہم ہے کیونکہ ہمارا مروجہ عدالتی نظام مخاصماتی (adversarial) ہے۔ اس نظام میں عدالتی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لئے جج صاحبان کا انحصار زیادہ تر فریقین کے وکلاء پر ہوتا ہے۔ وکلاء اپنی اِس کلیدی حیثیت کو انصاف کی فراہمی میں معاونت کے لئے بھی استعمال کرسکتے ہیں اور اِس میں رکاوٹیں کھڑی کرنے کے لئے بھی۔ حقیقتِ حال یہ ہے کہ وکلاء کی ایک تعداد ایسی ہے جو اپنی اس حیثیت کو نظام کی بہتری اور انصاف کے جلد اور سستی ترسیل کے لئے استعمال نہیں کررہی ہے۔ اس منفی کردار کا ایک منہ بولتا ثبوت روز افزوں ہڑتالوں کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ آج سے 40 سال قبل جب میں نے وکالت کا آغاز کیا تھا تو اس ملک کی عدالتوں میں ہڑتال نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ مگر آہستہ آہستہ ہڑتالوں کا وبال ہر طرف پھیل گیا۔ گزشتہ سال مرتب کی گئی ایک تحقیقاتی رپورٹ کے مطابق اسلام آباد کی ضلعی عدالتوں میں یکم جنوری 2014ء سے لے کر دسمبر 2014ء تک 50 سے زیادہ ہڑتالیں ہوئیں۔ یعنی عدالتی سال کے تقریباً ہر چوتھے دن وکلاء ہڑتال پر تھے۔ ان ہڑتالوں کی وجہ سے یا دیگر وجوہ پر التوا سے تقریباً 50 فیصد مقدمات مؤخر ہوتے رہے کیونکہ عدالتی معاونت کے لئے ایک یا دونوں فریقین کے وکیل غیر حاضر رہے۔ کچھ یہی حال دیگر ضلعوں کا بھی ہے۔ اسی طرح وکلاء کی جانب سے حیلے بہانے بنا کر التواء لینے کی روش بھی آج ہماری عدالتوں میں عام ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس پیشے کے کچھ معتبر نام بھی ایسی روش سے باز نہیں آتے۔ ظاہر ہے کہ وکلاء کے اس رویے کا نتیجہ انصاف کی فراہمی میں تاخیر کی صورت میں نکلتا ہے۔

نظامِ عدل کی تباہی میں جہاں ججوں اور وکیلوں کا ہاتھ ہے تو وہیں ساتھ ساتھ اِس کی ذمہ دار حکومت یا انتظامیہ بھی ہے۔ دیوانی عدالتوں میں مقدمات کا لامتناہی سلسلہ صرف اس لئے آرہا ہے کیونکہ سرکاری اور نیم سرکاری ادارے شہریوں کو ان کا حق دینے سے قاصر ہیں اور فوجداری مقدمات میں اگر معصوموں کو سزا اور مجرموں کو ڈھیل مل رہی ہے تو اِس کی ذمہ داری زیادہ تر پولیس اور استغاثہ کے محکموں پر عائد ہوتی ہے۔

اصل میں نظامِ عدل کی جڑیں کاٹنے میں ہمارا پورا سماج ملوث ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ دینِ اسلام کے اہم ترین تصورات میں سے ایک ''حق کی گواہی دینا'' ہے۔ مگر آج ہمارے سماج میں ایسے لوگ شاذ و نادر ہی ملتے ہیں جو نفع و نقصان کی پرواہ کیے بغیر عدالت میں آکر حق کی گواہی دیں۔ عدالت کیا عدالت سے باہر بھی اپنے گھروں کی چار دیواری سے باہر نکل کر کسی بھی جگہ برملا سچ بولنے والے لوگوں کا فقدان ہے۔ میرے لئے یہ بہانہ کوئی معنی نہیں رکھتا کہ سچ کی گواہی دینا آج کل بہت خطرناک ہے۔ سچ کہنا آج سے نہیں ازل سے ایک خطرناک عمل رہا ہے۔ سقراط نے حق گوئی و بے باکی کے عوض

زہر کا جام پیا اور اس وجہ سے گو وہ جہانِ فانی سے 2000 سال قبل رخصت ہو گیا مگر اس کا نام آج تک اور رہتی دنیا تک حق گوئی کی بناء پر زندہ و جاوید رہے گا۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ نے مسیحائی کی خاطر سولی کو گلے لگایا تھا۔ حضور سرورِ کائناتؐ نے سنگ زنی برداشت کی اور اپنے دندانِ مبارک میدانِ جنگ میں شہید کروائے تھے اور قافلہِ شوق کے، امام حسینؑ نے تو خون کا نذرانہ پیش کر دیا تھا مگر حق بات پر خاموشی اختیار نہ کی۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ اِن ہستیوں کے نام لیوا اِس معاشرے میں اکثر مقدموں میں شہادت علی الحق کے لئے عدالت میں کھڑا ہونے کے لئے لوگ مشکل سے ملتے ہیں۔ اِس بات کی اشد ضرورت ہے ہم بطورِ معاشرہ کلامِ پاک (سورۃ النساء کی آیت نمبر 135) کی طرف توجہ دیں۔ جس آیت کا ترجمہ درج ذیل ہے۔

''اے ایمان والو۔ انصاف پر خوب قائم ہو جاؤ۔ اللہ کے لئے گواہی دیتے رہو۔ چاہے اِس میں تمہارا اپنا نقصان ہو یا ماں باپ کا یا رشتہ داروں کا۔ فریقِ معاملہ خواہ مالدار ہو یا فقیر ہو۔ بہر حال اللہ کو اِس کا سب سے زیادہ اختیار ہے۔ خواہش کے پیچھے نہ جاؤ کہ حق سے الگ ہو جاؤ۔ اگر تم ہیر پھیر کرو گے یا منہ پھیرو گے تو اللہ کو تمہارے کاموں کی خبر ہے''۔

موجودہ نظام میں بہت مرتبہ نظر آتا ہے کہ بہت سے لوگ اس آیت کی لغویت اور معنویت سے منکر ہیں۔

نظامِ عدل کے انحطاط میں سماجی اور معاشرتی انحطاط کا بھی دخل ہے۔ عدلیہ میں میرے ایک بزرگ نے، جو درویش صفت اور درویش طبع تھے، ایک دن مجھ سے کہا کہ خواجہ صاحب! جس قوم کے افراد عدل و انصاف کے قائل نہ ہوں اور وہ خود جھوٹ بولیں، رشتے دار، عزیز، ہمسائے کا حق ماریں اور یہ برائیاں ساری قوم کی سوچ میں سرایت کر جائیں تو پھر انصاف کی فراہمی ممکن نہیں اور انصاف کی توقع بھی عبث ہے۔

مرض کی تشخیص کے بعد اب کچھ گزارشات اِس کے حل کے بارے میں کرتا چلوں۔ سب سے پہلے تو یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ جب کوئی عمارت بوسیدہ ہو جائے تو اُس کی تزئین و آرائش کام نہیں آتی۔ مولانا جلال الدین رومی اپنی مثنویِ معنوی میں فرماتے ہیں۔

آں بنائے کہنہ کہ باداں کنند
اول آں بنیاد را ویراں کنند

بات اصل میں جرأت کی ہے۔ جس کسی کے دل میں یہ خواہش ہے کہ وہ پاکستان کے نظامِ عدل کے ویران کھنڈر کو آباد دیکھنا چاہتا ہے، اسے اپنے دل میں فرسودہ نظام کو جڑ سے اکھاڑنے کا حوصلہ پیدا کرنا چاہیئے۔ ہمیں اس بات کا اقرار کرنے میں تأمل نہیں ہونا چاہیئے کہ ایسا نظام جو سستا اور فوری انصاف مہیا نہیں کر رہا۔ اسے بدلنا حکومت، ریاستی اداروں اور معاشرے کے ہر فرد بشمول وکلاء اور ججوں کے لئے ضروری ہے۔

موجودہ نظام کے معروضی حالات کے پیشِ نظر یہ سوال اُٹھتا ہے: کیا ہمارے معاشرے میں انصاف کی فراہمی کے

لئے موجودہ مخاصماتی نظامِ عدالت موزوں ترین ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں متبادل نظام ہائے عدل کی طرف بھی دیکھنے کی ضرورت ہے۔ شاید وہ تحقیقاتی (inquisitorial) نظام جو دُنیا کے کئی ممالک میں رائج ہے اور جو اسلامی روایتِ دادرسی وقضا سے قریب تر ہے اُس کو اپنانا ہمارے لئے مفید ہو۔ تحقیقاتی نظام میں ہر شہری کی شکایت پر دادرسی خود ریاست کا ذمہ بن جاتی ہے۔ پھر خواہ وہ مفلس و نادار ہو یا پیسے والا ہو۔ دونوں صورتوں میں اُسے انصاف دینا ریاست کا فرض ہوتا ہے۔

اصل میں ساری بات جرات وحق کی ہے۔

معاشرے میں وہ بے خوفی اور دردمندی کیسے لائی جائے جس کی ہمیں ضرورت ہے؟ اس سوال کا حتمی جواب میرے پاس نہیں مگر میں نے اپنی زندگی کے تجربے سے دیکھا ہے کہ انسان میں بے خوفی حقیقی ایمان سے آتی ہے اور دردمندی حضورؐ کی سُنت پر عمل کرنے سے، جنہوں نے ہر موقعے پر اور ہر غریب اور مفلس کے لئے مساوی انصاف فراہم کیا۔

میری خوش قسمتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے زندگی میں قانون کی چند قد آور شخصیتوں سے ملوا دیا۔ جو خوف وریا سے پاک تھے۔ ان شخصیتوں میں درویش منش جج جسٹس اے آر کارنیلئس اور جسٹس صمدانی سرِفہرست ہیں۔ میں نے عاجزی اور انکساری کے مجسم کارنیلئس صاحب کو بہت قریب سے دیکھا اور مجھے شرف ہے انہوں نے مجھے ہی اپنی وصیت کا (Executor) نامزد کیا۔ صمدانی صاحب کی عدالت میں تو مجھے پیش ہونے کا موقع بھی ملا اور میرے خاندان کا شرف ہے کہ میری تینوں بچیوں کے نکاح اُس بزرگ اور نیک ہستی نے ہی پڑھائے۔ میں نے شعبۂ قانون میں جو کچھ بھی حاصل کیا ہے یہ ان جلیل القدر اساتذہ کا حقِ شاگردی ادا کرنے کی ایک ادنیٰ سی کاوش تھی۔ اگر مجھے آج اس محفل میں کسی چیز کی کمی محسوس ہوتی ہے تو وہ صرف اس بات کی کہ کاش میرے یہ معزز اساتذہ آج اِس محفل میں شریک ہوتے۔

جہاں تک وکلاء حضرات کا تعلق ہے، تو ان میں فرض شناسی پیدا کرنے کے لئے لازمی ہے کہ وکلاء کے نظامِ احتساب میں کلیدی تبدیلیاں لائی جائیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ اسی نظام کا نتیجہ ہے کہ احتساب کی روایت کمزور سے کمزور تر ہوتی جارہی ہے۔ سپریم کورٹ کے ایک بنچ نے جب اِس معاملے کا نوٹس لیا تو معلوم ہوا کہ عوام الناس گزشتہ چند سالوں میں وکلاء کے خلاف بار کاؤنسلوں سے 7500 سے زائد شکایات کر چکے ہیں۔ مگر بار کاؤنسلوں نے ان میں سے کسی شکایت کی نہ تو کماحقہ تحقیق کی ہے اور نہ ہی کسی کو سزاوار ٹھہرایا ہے۔

اس مطالعے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ وکلاء کے احتساب کے لئے منتخب بار کونسلوں کو اپنا طریقۂ کار بہتر بنانے کی ضرورت ہے۔ تاکہ جن فریقین مقدمہ کو وکلاء کے خلاف شکایات ہوں اُن کی دادرسی جلد اور آسان طریقے سے ہو سکے اور بدعملی میں ملوث وکلاء کے خلاف قانون کے مطابق تادیبی کارروائی ہو سکے۔ وکلاء کی اکثریت فرض شناس ہے اور نظامِ عدل میں معاونت کی خواہشمند ہے۔ اگر ہمیں پاکستان میں سستا اور فوری انصاف مہیا کرنا ہے تو وکلاء کو مستعد ہو کر اپنی صفوں میں موجود بے عملوں پر گرفت کرنی ہوگی۔

اب میں ایک اور اہم پہلو پر کچھ کہنا چاہوں گا۔ جج اپنے منصب کے حوالے سے اُس مچھلی کی مانند ہے جو شفاف

شیشے کے چلو بھر پانی میں تیرتی ہے۔ ہر دیکھنے والا اس کی طرف اشارہ کرسکتا ہے، انگلی اٹھا سکتا ہے اور اسے بُرا بھلا بھی کہہ سکتا ہے۔ لیکن وہ مچھلی ان سب باتوں کا جواب نہیں دے سکتی۔ ججوں کے ضابطۂ اخلاق میں آرٹیکل 5 بھی شامل ہے، جس کے تحت یہ بات ضابطے کا حصہ ہے کہ وہ کھلی عدالت میں اور عوام کے سامنے اپنے فرائض کی انجام دہی کرتا ہے۔ مگر جج کے عدالت سے باہر بیانات دینے پر پابندی عائد ہے۔ ایک جج کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ عوام میں اس وقت بھی اپنی صفائی میں کچھ کہہ سکے، جب اس کے یا عدلیہ کے ادارے کے خلاف بے بنیاد اور جھوٹے بیانات جاری کیے جا رہے ہوں۔ جج تنقید کے عادی ہوتے ہیں اور ان کے فیصلوں پر عوام اور میڈیا کو رائے دینے کا حق ہے۔ البتہ بعض اوقات یوں لگتا ہے جیسے رائے دینے والے نے فیصلہ یا تو پڑھا نہیں اور اگر پڑھا ہے تو پھر سمجھا نہیں۔

آخر میں ایک اشارہ مستقبل کی طرف۔ صحت مند انسانی ذہن کا خاصہ یہ ہے کہ اُس کی سوچ ہمیشہ زیرِ ارتقاء رہتی ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ انسان اپنی آنکھ اور کان کھلے رکھے۔ نت نئے مشاہدات سے مستفید ہوتا رہے اور افکارِ تازہ کو قبول کرنے سے نہ گھبرائے۔ اس ضمن میں میں اپنا ایک تجربہ آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔

ہمارے آئینی قانون میں آج کل جو شق شاید سب سے زیادہ زیرِ بحث آتی ہے وہ آرٹیکل 184(3) ہے جس کے تحت سپریم کورٹ کو نفاذِ انسانی حقوق اور مفادِ عامہ کی بابت اختیارِ سماعت حاصل ہے۔

اُس آٹھ سالہ عرصے میں جب کہ میں لاہور ہائی کورٹ کا جج تھا، اِس اختیارِ سماعت کے بارے میں میری سوچ بھی وہی تھی جو کسی روایتی سوچ کے حامل وکیل یا جج کی ہوتی ہے۔ یعنی میں انسانی حقوق اور مفادِ عامہ کے ضمن میں سپریم کورٹ میں براہِ راست دائر کردہ آئینی درخواستوں کا زیادہ پرجوش حامی نہیں تھا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری کا ، جو اِس اختیارِ سماعت کے پرجوش حامی تھا، میں اُس زمانے میں اُن کے طرزِ عمل کا ناقد تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ یہ درخواستیں عدالت کی توجہ عام مقدموں سے پرے کرتی ہیں اور اس طرح عدالت کے معمول کے کاموں میں دخل انداز ہوتی ہیں۔ میرا مزید یہ خیال تھا کہ اِس اختیارِ سماعت میں قواعد وضوابط نہ ہونے کے برابر ہیں اور یوں جج صاحبان کی ذاتی ترجیحات کو ضرورت سے زیادہ دخل ہے اسی لئے اس سے گریز ہی بہتر ہے۔

یہ بات بھی واضح کرنا چاہتا ہوں کہ اُس وقت میں نہ صرف سابق چیف جسٹس کی طرزِ عمل کا ناقد تھا بلکہ ذاتی طور پر اُن سے واقف نہیں تھا۔ اگر اُن سے میری ملاقات ہو جاتی تو میں تو ضرور اُنہیں پہچان لیتا لیکن وہ شاید مجھے نہ پہچان پاتے کیونکہ اپریل 2007ء سے پہلے میں اُنہیں کبھی نہیں ملا تھا۔ میں نے مارچ 2007 میں جب عدالتِ عالیہ لاہور کو خیر باد کہا تو اس کا سبب صرف یہ تھا کہ اِس عدالت کی ساکھ اور وقار پر ایسا غیر آئینی حملہ کیا گیا تھا جو عدلیہ کے سربراہ کے ساتھ تحقیر آمیز سلوک کی شکل میں سامنے آیا اور یہ میری برداشت سے باہر تھا۔

خیر قصہ مختصر یہ کہ جب 2009 میں ، اس عدالت کا رکن بنا اور مجھے آرٹیکل 184(3) کے تحت آنے والی درخواستوں اور سادہ کاغذ پر لکھی ہوئی چٹھیوں کو پڑھنے اور اُن پر مبنی مقدمات کو بذاتِ خود سُننے کا موقع ملا، تب میری سوچ میں

نمایاں تبدیلی آئی۔ جب میں نے یکے بعد دیگرے ایسے مقدمات کی سماعت کی جہاں ایک طرف معاشرے کے کمزور ترین اور پسے ہوئے طبقات جبر اور محرومی کا پیکر بنے کھڑے تھے اور دوسری طرف ریاست کے اعلیٰ ترین نمائندے کھڑے تھے جو اپنے فرائض کی ادائیگی سے منکر تھے اور اپنی ناانصافیوں کا دفاع کر رہے تھے۔ تب میرے ذہن میں یہ سوال اُٹھا کہ اگر ہم اِس اعلیٰ ترین عدالت میں بیٹھ کر اِن محروموں کی دادرسی نہ کریں تو یہ طبقہ بالکل بے سروسامان اور انصاف سے محروم رہ جائے گا۔ ایسا کرنا آرٹیکل 184(3) کے تحت دیئے گئے اختیارات سے دست کشی کے مترادف ہوگا۔

معروضی حقیقت یہ ہے کہ پاکستان میں ایسے بہت سے بے نوا اور غریب طبقے موجود ہیں جو عام قانونی نظام کے ذریعے سستا اور فوری انصاف حاصل کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ یہ ہمارے نظام کی بدقسمتی ہے۔ مگر یہ عدالت 184(3) کے تحت اُن محروموں کے دکھوں کا کچھ تو مداوا کر سکتی ہے۔ پھر میں نے کئی مقدمات میں اپنی آنکھوں سے ایسا ہوتے دیکھا۔ ایک مقدمے میں اِس عدالت کے ایک فیصلہ سے ملک کے ہر کونے میں مقیم لاکھوں لیڈی ہیلتھ ورکروں کو اُن کے جائز حقوق ملے۔ ایک مقدمے میں ملک کے ہر سرکاری ملازم کے حقوق کا اعادہ کیا گیا اور ایک میں اقلیتوں کے حقوق کو تحفظ فراہم کیا گیا۔ ایسی اختیارِ سماعت کے تحت پتھر کوٹنے والے ہزاروں مزدوروں اور کچی آبادیوں میں بسنے والے لاکھوں ناداروں کو اُن کے حقوق دلانے کی طرف پیش قدمی بھی شروع ہوئی۔

تجربے اور تحقیق سے مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ دراصل آرٹیکل 184(3) کے تحت دائر شدہ مقدمات کی تعداد بہت محدود، اِن پر صرف ہونے والا عدالتی وقت بہت کم، مگر اِس سے حاصل ہونے والے فوائد بہت زیادہ ہیں۔ اِس سلسلے میں کچھ شماریات جو میرے تحقیقی عملے نے اکٹھے کئے قابلِ ذکر ہیں: ایک عدالتی سال میں سپریم کورٹ میں تقریباً 20,000 نئے مقدمات دائر ہوتے ہیں۔ عدالتی اعداد و شمار بتاتے ہیں کسی بھی سال میں 30 سے زائد از خود (سوموٹو) نوٹس نہیں لئے گئے۔ لہٰذا یہ تاثر قائم کرنا کہ ایسے مقدمات کی تعداد بہت زیادہ ہے، بے بنیاد ہے۔ ظاہر ہے کہ اتنی قلیل تعداد کے مقدموں پر نہ تو زیادہ عدالتی وقت خرچ ہوتا ہے نہ پیسہ۔ پھر کیا وجہ ہے کہ یہی وہ مقدمات ہیں جن کی بناء پر سپریم کورٹ کو نشانۂ تنقید بنایا جاتا ہے۔

ہوسکتا ہے کہ اِس کی وجہ کم علمی ہو مگر یہ بھی ممکن ہے کہ 184(3) کے تحت گنے چنے مقدمات کی سماعت ہمارے سماج کے اُن طبقوں کو بہت گراں گزرتی ہے جو اِس نظامِ عدل کی زبوں حالی کے ذمہ دار بھی ہیں اور اس کے طفیلی بھی۔ شبِ ظلمات میں جلتا ہوا یہ چھوٹا سا دیا۔ کچھ لوگوں کی آنکھوں میں شاید صرف اس لئے کھٹکتا ہے کیوں کہ اِس سے اُن محروموں کی امیدیں وابستہ ہیں، جنہیں ورنہ انصاف کی کوئی بھی امید نہیں۔

ہمیں یاد رکھنا چاہیئے اگر آج اس ملک کے بے سہارا اور بے نوا طبقوں کی امید بھری نظریں ہمارے نظامِ عدل کی طرف اٹھتی ہیں اور چند ایک لوگ عدالتوں سے مایوس نہیں ہوتے اور اِن کے لئے دعا گو ہیں تو اِس کا ایک بڑا سبب 184(3) کے تحت اٹھائے گئے غیر معمولی اقدامات ہیں۔ ورنہ ہمارے معمول کے نظامِ عدل میں انصاف کے حصول کے

لئے ایک غریب اور نادار شخص کو کتنے سال اور کتنے پیسے درکار ہیں اُن کا ذکر تو ہم پہلے کر چکے ہیں۔

اس لئے میں امید کرتا ہوں کہ اب جب اس عدالت نے آرٹیکل (3)184 کے شعوری استعمال سے پاکستان کے سماج کے محروم طبقوں میں انصاف کی امیدیں پیدا کر دی ہیں تو ان امیدوں کو پورا کرنے کے لئے مزید پیش رفت بھی کی جائے گی اور اُس چراغ کو جسے روشن کرتے کرتے ہم نے کئی دھائیاں صرف کر دیں، اُسے گُل نہیں ہونے دیا جائے گا۔ بلکہ آئندہ آنے والے مقدمات میں بتدریج اس اختیارِ سماعت کے اصولوں کو اور واضح کر دیا جائے گا۔ اِس ضمن میں انگلستان کی (Equity) عدالتوں کا تجربہ اور ارتقاء ہمارے سامنے ہے جس سے یہ عیاں ہے کہ ان عدالتوں کو اپنے اصول وضوابط طے کرنے میں تین صدیاں لگیں۔ ہماری اپنی آئینی تاریخ میں رٹ کا اختیارِ سماعت 1956ء کے آئین میں عدالتوں کو سونپا گیا اور ساٹھ سال تک اس اختیارِ سماعت کے اصول وضوابط طے ہوتے گئے۔ آرٹیکل (3)184 کے استعمال کا تو صحیح استعمال ہی 1988ء میں ہوا۔ اس وقت سے لے کر آج تک اس اختیارِ سماعت کے اصول روز بروز نظائر کی شکل میں وضع ہوتے چلے جا رہے ہیں۔

آخر میں، میں یہ کہنا چاہوں گا کہ میرے لئے گزشتہ سولہ سال سے زائد کے عرصے کا ہر لمحہ صبر آزما اور ایک ایک گھڑی آزمائش کی گھڑی رہی ہے۔ کیونکہ یہ عہدہ اور یہ منصب میری ذاتی ملکیت نہیں بلکہ عوام الناس کی امانت ہے اور بطور امین، میں عوام کے سامنے جواب دہ ہوں۔

بہر حال میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے ایمان سے نوازا ہے اور ہر قدم پر میری مدد فرمائی ہے۔ سب طاقت اللہ تعالیٰ ہی کی ہے اور اُس کا فضل وکرم ہو تو تمام آزمائشوں اور تمام صبر آزما گھڑیوں سے گزرنا ممکن ہوتا ہے۔

میں اپنے خاندان کے افراد اور خاص طور پر اپنے بڑے بھائی اور اپنے نہایت ہی قریبی دوست کا ذکر بھی کرنا چاہتا ہوں جن کی سرپرستی کے بغیر میں اپنے کارہائے منصبی پوری طرح ادا نہیں کر سکتا تھا۔ اپنے دفتری اور گھر کے عملے کا بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے نہایت دیانت داری اور تن دہی سے مجھے اپنا کام کرنے میں مدد دی۔

اس عہدے اور منصب کے ساتھ بھاری اور گراں ذمہ داریاں منسلک ہیں اور آج اپنے مدتِ منصبی کے آخری روز میں صرف جھوک شریف کے عنایت شاہ شہید کا یہ شعر کہہ کر اپنی بات ختم کرتا ہوں۔

سر بر قدمِ یار فدا شد چہ بجا شد
این بارِ گراں بود ادا شد چہ بجا شد

آپ کی توجہ کا بہت شکریہ